انکارِ تاریخ سے انکارِ حدیث تک

براہِ راست۔محمد اسماعیل ریحان

انکارِ تاریخ سے انکارِ حدیث تک

براہِ راست ۔ محمد اسماعیل ریحان

دورِ حاضر میں خود رائی، آزاد خیالی، علما پر عدم اعتماد، اپنے محدود مطالعے اور قیاسات پر حتمی یقین کا رجحان بڑھنے سے طرح طرح کی علمی وفکری گمراہیوں کو پنپنے کا موقع مل رہا ہے۔ ان علمی وفکری گمراہیوں میں سے ایک خطرناک رجحان ''انکارِ تاریخ'' کا بھی ہے۔ اس رجحان کے پیچھے اگرچہ عموماً اسلام اور مقدس شخصیاتِ اسلام کے دفاع کا جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے، جو یقیناً قابلِ تعریف ہے، مگر جب اچھے جذبے سے کیا گیا کام، اسلاف کے علمی منہج سے ہٹ جائے تو اس کے بعد کسی بھی غلطی؛ بل کہ گمراہی کا شکار ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ''فتنۂ انکارِ تاریخ'' میں مبتلا افراد عقائد کے دفاع کے جوش میں ان اسلامی مآخذ کی جڑوں پر تیشہ چلا رہے ہیں، جن پر دین استوار ہے۔

''انکارِ تاریخ'' کا رجحان، کوئی علمی بنیاد نہیں رکھتا۔ بل کہ یہ ایک اور انتہا پسندانہ طرزِ فکر کے ردِ عمل میں پیدا ہوا ہے۔ اور وہ ہے تاریخی روایات کی حیثیت اور اسناد کی جانچ کیے بغیر ان پر آنکھیں بند کر کے ایمان لانا اور ان سے حتمی نتائج اخذ کر کے تاریخ کو غلط شکل میں پیش کرنا۔

دو تین صدیوں سے مستشرقین؛ اسلامی تاریخ کے مآخذ سے بہت سے واقعات کو غلط رنگ دے کر پیش کرتے آئے ہیں۔ کمزور بل کہ موضوع روایات کو شہرت دے کر اسلام کی مقدس شخصیات پر حملے کرنا بھی ان کی عادت ہے۔ ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر بعض مسلم اسکالرز نے بھی ''تاریخ'' کی ہر روایت پر بلا تردد یقین کرنے اور ماضی کی شخصیات اور واقعات پر بے دھڑک تبصرے کرنے کی روایت کو جنم دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام بھی ان کے قلم کی زد سے محفوظ نہیں رہے۔

اس طرزِ فکر کی تردید میں کچھ لوگ اسلامی شخصیات؛ خصوصاً صحابہ کرام کے دفاع میں دوسری انتہا پر چلے گئے اور انہوں نے یکسر تمام تاریخ کو ساقط الاعتبار اور تمام مؤرخین کو بدعقیدہ، گمراہ، سبائی ایجنٹ اور اسلام دشمن تصور کر لیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے لیے قرآن وحدیث ہی کافی ہے۔ تاریخی روایات کو ہم منہ لگانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے۔

بہ ظاہر یہ سادہ سی بات لگتی ہے، مگر درحقیقت یہ مسئلہ اتنا ہلکا نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی ایک آدھ کالم، مضمون یا کسی بیان وتقریر تک محدود رکھے تو شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں ہو پائے گا کہ وہ کتنا بڑا دعویٰ کر رہا ہے۔

حقیقت اس وقت کھلتی ہے، جب اس دعوے کی علمی بنیادوں پر وارد ہونے والے اشکالات اور الجھنوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے میں اپنے موقف کے دفاع میں انسان ''انکارِ تاریخ'' سے سفر شروع کرتا اور ''انکارِ حدیث'' پر جا پہنچتا ہے۔ یہ کوئی ہوائی بات نہیں، زمینی حقیقت ہے۔ میں ایسے حضرات کو جانتا ہوں جو کل اسلامی تاریخ کو جھوٹ کا پلندہ بتاتے تھے اور آج وہ حدیث پر اعتماد سے بھی محروم ہو کر صرف قرآن سے روشنی لینے کا پرچار کر رہے ہیں کیوں کہ ذخیرۂ حدیث بھی ہر جگہ ان کے دعووں کا ساتھ نہیں دیتا۔

ایسے ہی ایک صحافی دوست، یزید بن معاویہ کی مدح میں بخاری کی حدیثِ قسطنطنیہ کی روایت کا ذکر کر رہے تھے۔ (روایت اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور یزید کو اس جہاد کی قیادت کی سعادت ملنا بھی یقیناً ثابت ہے) تاہم میں نے دوسرے پہلو پر توجہ دلاتے ہوئے عرض کیا کہ بخاری میں یہ بھی تو ہے کہ یزید کے دور میں حرم مکہ پر حملہ کیا گیا اور ایک صحابی ابوشریح رضی اللہ عنہ نے جب اس سے منع کیا تو یزید کے گورنر عمرو بن سعید نے انہیں جلی کٹی سنائیں۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۵۹۲۴ باب لیُبلغ العلم)

یہ سن کر وہ صحافی دوست فوراً بولے: ''ہم ایسی حدیث کو نہیں مانتے جو قرآن کے خلاف ہو۔ امام بخاری شیعوں سے بلا تردد روایات لیتے تھے۔ ایسی حدیثیں پھینک دینے کے قابل ہیں۔''

یہ ذہنیت اب عام ہو چکی ہے۔ انکارِ تاریخ کا سلسلہ انکارِ حدیث تک دراز ہوتا جا رہا ہے۔

یہ درست ہے کہ ہر دور کی تاریخ کا ہمارے دین سے تعلق نہیں۔ دنیا میں حالات و واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور ان کے بارے میں ہر وقت آراء مختلف رہتی ہیں۔ ایک بات ایک گروہ کے نزدیک یقینی ہوتی ہے اور دوسرا فریق اسے سفید جھوٹ قرار دیتا ہے۔ ایک حکمران کسی کے ہاں ممدوح ہوتا ہے اور کسی کے نزدیک قابلِ ملامت۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جس تاریخ کو آج کل یکسر قابلِ ترک قرار دیا جا رہا ہے، اس میں پہلی صدی سے تیسری صدی ہجری کے راویوں کا جمع کردہ ذخیرۂ روایات بھی شامل ہے۔ یہ سیرتِ رسول، دورِ صحابہ اور ایام تابعین و تبع تابعین کی تاریخ ہے۔

اس تاریخ کا یکسر انکار کرنے کے بعد انسان انکارِ حدیث سے نہیں بچ سکتا۔ کیوں کہ جن راویوں کو ہم تاریخِ طبری، طبقات ابن سعد اور انساب الاشراف جیسے بنیادی تاریخی مآخذ میں دیکھتے ہیں، ان میں سے بہت سوں کو بخاری، مسلم، موطا، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور طحاوی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر کے بنیادی مآخذ میں بھی ان راویوں کے نام بار بار ملیں گے۔ اگر قرونِ اولیٰ کی تاریخ کو خرافات کا مجموعہ قرار دے

دیا جائے تو یہ ثقہ راوی بھی غیر معتبر قرار پائیں گے۔ اب ظاہر ہے کہ جو حضرات تاریخی معاملات تک میں قابلِ اعتماد نہ مانے جائیں، تفسیرِ قرآن اور حدیثِ رسول کے بارے میں ان پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے، جہاں ہر قدم پر تاریخ سے کہیں بڑھ کر حزم و احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے؟

عقائد، عبادات، اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے سارے احکام کا دارومدار تفسیر و حدیث کے ذخیرے پر ہی تو ہے۔ اگر تاریخ سراسر جھوٹ کا پلندہ ہے تو اسی کے درجنوں ناقلین سے منقول ذخیرۂ حدیث کی وہ سیکڑوں احادیث بھی ساقط قرار پائیں گی، جنہیں بخاری و مسلم اور امام احمد جیسے محدثین پورے اعتماد سے پیش کر رہے ہیں۔ یہی نہیں، بل کہ خود یہ محدثین اور فقہا بھی اصولِ دین اور علم روایت و درایت سے تہی دست اور جاہل قرار پائیں گے۔ ان کی باقی روایات بھی مشکوک ہو جائیں گی۔ یہ خدشہ ہمیشہ رہے گا کہ وہ بھی جعلی اور بناوٹی نہ ہوں۔ عین ممکن ہے کہ کوئی انہیں بدعتی، گمراہ اور سبائی ایجنٹ تصور کر کے کہے کہ وہ جان بوجھ کر اسلام کے نام پر یہ گمراہی پھیلاتے رہے۔ اس کے بعد ہمارے پاس اسلامی عقائد و احکام کا کون سا ماخذ بچے گا جس پر ہم اعتماد کر سکیں؟

ایک مثال سے اس بات کو سمجھیے۔ تاریخِ طبری میں حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ مختلف راویوں سے منقول ہے۔ ان میں سے بیشتر راوی ضعیف ہیں۔ مثلاً ابو مخنف اور ہشام کلبی وغیرہ۔ اس بات کو بنیاد بنا کر کچھ حضرات واقعۂ کربلا کو محض افسانہ قرار دے رہے ہیں اور اس سانحے میں اس دور کے حکام کی زیادتیوں کو تسلیم کرنے کے لیے اس لیے تیار نہیں کہ یہ واقعات تاریخ میں بیان ہوئے ہیں، قرآن و حدیث میں نہیں۔ ان کے خیال میں خیر القرون کے لوگ ایسا ظلم نہیں کر سکتے تھے۔

مگر طبری نے یہ واقعہ بعض معتبر محدثین اور ثقہ راویوں سے بھی نقل کیا ہے، جن میں سے حصین بن عبد الرحمن، ابو عوانہ، سعید بن سلیمان الضبی الواسطی اور عباد بن العوام قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات سے امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی اور امام نسائی نے روایتیں لی ہیں۔ حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی جیسے ناقدین نے ان حضرات کو ثقہ، ثبت اور حجت کہا ہے۔ (تقریب التہذیب: ۱۳۸۳، ۳۲۲۹، ۲۹۰۳، ۹۴۳۱۔ تاریخ بغداد: ۱۹۱۴۱، سیر اعلام النبلاء ۲۱/۶۷۳)

اگر واقعہ کربلا کو افسانہ تصور کر لیا جائے تو اتنا ہی نہیں ہوگا کہ یہ سارے راوی گپ باز اور فریبی قرار پائیں گے، بل کہ صحاحِ ستہ کی وہ تمام روایات بھی ہمارے لیے ناقابلِ اعتماد ٹھہریں گی جو اُن راویوں سے منقول ہیں۔ پھر ایک واقعہ کربلا پر ہی کیا موقوف ہے، طبری میں مزید درجنوں حوادث اور قضایا ایسے ہیں جنہیں محدثینِ صحاحِ ستہ کے شیوخ سے نقل کیا گیا ہے۔ کیا صحاح کی ایسی تمام روایات ترک نہیں کرنا پڑیں گی، جن کے راویوں کو تاریخ طبری میں افسانہ ساز مانا جا رہا ہے؟

پھر بات طبری اور صحاحِ ستہ ہی کی نہیں، اس دور میں تالیف کی گئی باقی تمام کتبِ تاریخ وسیرت تک بھی پہنچے گی جو بعد کے تمام اسلامی لٹریچر کے لیے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً سیرت ابن اسحٰق، سیرت ابن ہشام، فتوح البلدان، طبقات ابن سعد، انساب الاشراف، تاریخ خلیفہ بن خیاط، تاریخ المدینہ لابن شیبہ وغیرہ۔ ان کتب کے راویوں اوران کے شیوخ سے منقول روایات کو تمام کتبِ حدیث وتفسیر میں چھانا جائے تو ایسی روایات کی تعداد سیکڑوں میں ہوں گی، جن سے عقائد، عبادات، معاملات اور نکاح وطلاق جیسی بنیادی اسلامی تعلیمات میں استفادہ کیا جارہا ہے۔ پس اگر آج ان مؤرخین اور راویوں کو افسانہ نویس تصور کرلیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کتبِ حدیث وتفسیر سے بھی اعتماد اٹھ جائے گا۔

انکارِ تاریخ کے علم بردار حضرات کے ساتھ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ خود کو صحابہ کرام کے دفاع کا واحد اجارہ دار تصور کرتے ہیں اور اس معاملے میں انہیں اس حد تک غلو ہے کہ وہ اپنے غیر علمی طرزِ استدلال کو حتمی باور کرانے اور خود کو برحق جتانے کے لیے ''جمہور اہلِ سنت'' کو سبائیت زدہ قرار دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔ جیسا کہ ان کے ایک امام برملا فرماتے ہیں (اور ان کے پیروکاران کا یہ قول بڑے فخر سے نقل کرتے ہیں) کہ ''صحابہ کی عظمت بچانے کے لیے اکابر کے سر جھکا دو اور اسلاف کی پگڑیاں گرادو۔''

ہم کہتے ہیں کہ اکابر اور اسلاف ہی سے ہم نے صحابہ کی عظمت سیکھی ہے۔ انہی سے صحابہ کا تعارف ملا ہے۔ اگر اصول وضوابط کے مطابق علمی ونظری بحث ہو تو دفاعِ صحابہ کے لیے اسلاف کو سبائیت زدہ کہنے کی ضرورت کہیں بھی پیش نہیں آئے گی۔ ہاں! جس بے اصولی کے ساتھ آپ دفاع کرنے نکلے ہیں، اس میں صحابہ کو بچاتے بچاتے، اپنے پاس حدیث رہے گی نہ قرآن۔

ان حضرات نے دفاعِ صحابہ کا ایک ہی خود ساختہ اصول ملحوظ رکھا ہوا ہے کہ جو بات بھی صحابہ کی صفات کے خلاف محسوس ہو، جو ان کے حق میں نامناسب لگے اسے رد کردیا جائے۔ قولِ اکابر ہو یا قول ائمہ مجتہدین، وہ تاریخی روایت ہو یا حدیث۔ صحیح ہو یا ضعیف۔

یہ اصول بالکل آزاد ہے۔ اسے پیش کرتے ہوئے کبھی یہ بھی واضح نہیں کیا گیا کہ کون سی چیزیں درحقیقت صحابہ کی صفات کے دائرے میں داخل ہیں اور کون سی نہیں۔ جو باتیں اسلاف کے نزدیک بشری تقاضے، اضطراری غلطیاں یا تکوینی چیزیں شمار ہوتی تھیں، آج انہیں بھی صفاتِ صحابہ کے خلاف تصور کرکے اسلاف کو لتاڑا جارہا ہے کہ انہوں نے ایسی باتیں کیوں نقل کیں۔

اگر اس عجیب اصول کو مدارِ تحقیق بنایا جائے گا تو اس کی زد میں سیکڑوں صحیح روایات بھی آئیں گی۔ فقط جنگ جمل اور صفین کی احادیث نہیں، بل کہ ہر وہ روایت آئے گی جو کسی کو عجیب لگے گی۔ اس خود ساختہ اصول پر وہ آیات بھی پوری نہیں اترتیں، جن میں صحابہ کو بعض لغزشوں پر تنبیہ ہے۔ کہیں غزوۂ احد سے فرار پر، کہیں بدر کے قیدیوں کے مسئلے پر۔ جو علم سے جتنا زیادہ تہی دست ہوگا، اسے اتنی ہی زیادہ روایات پر اشکال ہوگا اور وہ اصرار کرے گا کہ یہ جعل سازی ہے۔

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رازِ اہلِ مکہ پر فاش کرنے کی کوشش کرنا، حضرت ماعز کا واقعہ، غامدیہ صحابیہ کی چوری، خثعمیہ کا سنگ سار ہونا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوہریرہ کو رائے کے اختلاف کی بنا پر دھکا دے کر زمین پر گرا دینا... سبھی غیر معتبر لگے گا۔ صحابہ کے علمی تفردات بھی؛ جو اپنی جگہ ثابت ہیں مگر معمول بہا نہیں، صفاتِ عالیہ کے خلاف محسوس ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا آگ پر پکی ہوئی چیزیں استعمال کرنے سے وضو ٹوٹنے کا فتویٰ دینا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ستر چھونے سے وضو ٹوٹ جانا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک بلوغت کے بعد بھی رضاعت ثابت ہو جانا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک تیمّم میں گٹوں تک ہاتھ پھیرنا کافی ہونا... کتنے ہی مسائل ہیں، جنہیں دیکھ کر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ صحابہ کا صحیح مسئلے سے لاعلم رہنا ناممکن ہے۔ پس یہ روایات ان کی شان کو مجروح کرنے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔ کسی کو ایک حدیث ''اولئک ھم الراشدون'' کے خلاف لگے گی، کسی کو دوسری حدیث ''رُحماء بینھم'' سے متصادم لگے گی۔

غرض لوگوں کو علی الاطلاق انکارِ تاریخ کا درس دینا تو آسان ہے، مگر اس فتنے کا دروازہ کھول کر انہیں انکارِ حدیث سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔

اسلاف اور ہمارے اکابر میں سے یہ دعویٰ کسی کو نہیں کہ کتبِ تاریخ کی ہر ہر روایت ہر موقع پر قابلِ استدلال ہے۔ نہ ہی کوئی یہ کہتا ہے کہ ان میں ضعیف اور موضوع روایات نہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ان میں صحیح اور ضعیف اور بعض موضوع روایات ملی جلی ہیں مگر چوں کہ ہر مؤرخ نے اپنی روایات کو محدثین کے انداز میں اپنے سلسلۂ اسناد کے ساتھ پیش کیا ہے اس لیے اہلِ علم صحیح، حسن اور ضعیف کا پتا لگا سکتے ہیں۔ اسی لیے کتبِ تاریخ کے بیشتر مواد کو اصحابِ جرح وتعدیل قابلِ اعتماد قرار دیتے آئے ہیں۔

ضعیف روایات کو اہلِ علم نے جمع کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کیا ہے۔ مانا کہ عقائد، احکام اور سنن کی بحث میں ضعیف روایات قابلِ استدلال نہیں ہوتیں۔ اسی طرح اہلِ اصول نے اسلامی عقائد کی مخالفت، بدعات کی حمایت اور مقدس شخصیات پر طعن سے آلودہ ضعیف روایات کو بھی ساقط الاعتبار کہا ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ضعیف روایات ہر جگہ ہر وقت قابلِ ترک ہوں۔ جس طرح کتبِ حدیث میں فضائل ومناقب سے متعلقہ روایات کو ضعف کے باوجود قابلِ قبول مانا جاتا ہے، اسی طرح تاریخی جزئیات کے لیے بھی ضعیف روایات مقبول ہوتی ہیں۔ حافظ ابن کثیر، حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہم اللہ جیسے محتاط اور نقاد حضرات کو بھی ان سے استفادہ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔

پس اگر کسی کو مسلکِ اہل سنت والجماعت پر قائم رہنا ہے تو اسے ان کتبِ تاریخ کو وہی حیثیت دینا ہوگی جو اسلاف دیتے آئے ہیں۔ بصورتِ دیگر اسے اپنے دعوے کی بنیادوں کا دفاع کرنا مشکل ہوگا اور پسپائی اسے پہلے ذخیرۂ حدیث میں شکوک وشبہات اور پھر انکارِ حدیث تک پہنچا کر رہے گی۔

منکرینِ حدیث کے سوا سب مانتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر بھی حدیث کے بغیر نہیں سمجھی جاسکتی اور حدیث کا پورا سلسلہ، رجال پر موقوف ہے۔ اگر علم رجال کا اعتبار ختم ہوجائے تو ہم کسی ایک حدیث کو بھی صحیح اور معتبر ثابت نہیں کرسکتے۔ علم رجال کی کتب میں جن حضرات کو ثقہ، حجت اور صادق کہہ دیا گیا ہے، ہمارے لیے ان پر اعتماد کیے بغیر چارہ نہیں۔

رجال کی قدیم کتب میں العجلی کی ''الثقات''، امام نسائی کی ''الضعفاء والمتروکون'' اور ابن حبان کی ''الثقات'' قابل ذکر ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں اسماء الرجال کے قدیم ذخیرے سے استفادہ کرکے موسوعات کی طرز پر کام ہوا۔ حافظ ذہبی، علامہ مزی، علامہ سبکی اور حافظ ابن حجر جیسے وسیع النظر محققین اس میدان میں پیش پیش تھے۔ چناں چہ سیر اعلام النبلاء، میزان الاعتدال، تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب اور لسان المیز ان جیسے علمی شاہکار وجود میں آئے۔ جن میں حدیثی، تفسیری، فقہی اور تاریخی روایات کے تمام راویوں کے کوائف محفوظ کردیے گئے۔ اگرچہ بعض راویوں کے بارے میں اصحابِ جرح وتعدیل کی آرا مختلف بھی ہیں، مگر جسے سب نے یا اکثریت نے معتبر قرار دیا ہو، اسے معتبر مانا جاتا ہے۔ اسی طرح جسے اکثریت نے مجروح، ضعیف یا کذاب مانا ہو، اسے ترک کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ غرض اسلامی علوم سے متعلقہ کسی بھی روایت پر تحقیق کے لیے کتبِ رجال پر اعتماد کیے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔

منکرینِ تاریخ، اسماء الرجال کا انکار نہیں کرتے، بل کہ بڑے شدومد سے نہ صرف اس پر اعتماد کا اظہار کرتے ہیں بل کہ اس فن میں اپنی مہارت کا دعویٰ کرتے ہوئے جگہ جگہ کتبِ جرح وتعدیل کے حوالے دے کر اپنی علمیت کا رعب جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت اس بارے میں بھی ان کی حالت بارش سے بچ کر پرنالے کے نیچے کھڑے ہونے والوں سے مختلف نہیں۔ کیوں کہ علم رجال کے اس عظیم الشان ذخیرے کی حیثیت بھی تاریخ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ یہ بھی کوئی قرآن وحدیث نہیں، انسانوں کے بارے میں انسانوں کی آراء کا ریکارڈ ہے۔ جو شخص تاریخ کو یہ

کہہ کر مسترد کرتا ہے کہ یہ کوئی قرآن و حدیث نہیں تو اس پر خود بخود یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ وہ آخر علم الرجال پر کس طرح اعتماد کر رہا ہے، وہ بھی تو تاریخ ہی کی ایک قسم ہے۔ اسی لیے علم الرجال کی ابتدائی کتب مدوّن کرنے والوں نے انہیں ''تاریخ'' کا نام دیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے رجال کے بارے میں جو روایات جمع کیں انہیں التاریخ الکبیر، التاریخ الاوسط اور التاریخ الصغیر کا نام دیا۔ امام یحییٰ بن معین کے پاس محفوظ رجال کا علم، مدون ہو کر ''تاریخ ابن معین'' کے نام سے موسوم ہوا۔ اسی طرح ابن ابی خیثمہ نے رجال کے بارے میں اصحابِ جرح وتعدیل کی آراء کو ''تاریخ ابن ابی خیثمہ'' کے نام سے مدون کیا۔ خطیب بغدادی نے بغداد کے رجال کے حالات کو ''تاریخ بغداد'' میں جمع کیا۔

رجال میں جب صحابہ کے حالات کو الگ جمع کیا جانے لگا تو علامہ ابن عبدالبر کی الاستیعاب، ابن اثیر جزری کی اسد الغابہ اور حافظ ابن حجر کی الاصابہ جیسی کتب معرضِ وجود میں آئیں۔ یہ وہ کتب ہیں جن کے بغیر ہمیں صحابہ کرام کے حالات بھی معلوم نہیں ہو سکتے۔

اسی علم رجال کو جب طبقات کی شکل میں مدون کیا گیا تو اسے علم طبقات کا نام دیا گیا اور طبقات ابن سعد، طبقات خلیفہ، طبقات نسائی، طبقات الفقہاء، طبقات الحنابلہ، طبقات الشافعیہ الکبریٰ اور الجواہر المضیئہ فی طبقات الحنفیہ جیسی کاوشیں سامنے آتی چلی گئیں۔

جن حضرات نے تاریخ، علم الرجال، حالاتِ صحابہ اور طبقات کی کتب کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان سب میں ایک دوسرے سے جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے۔ یعنی رجال میں بہت سی روایات، طبری جیسی کتبِ تاریخ سے نقل کی گئی ہیں۔ اسد الغابہ، الاصابہ اور الاستیعاب میں صحابہ کے حالات کا بڑا حصہ کتبِ تاریخ سے لیا گیا ہے۔ البدایہ والنہایہ اور تاریخ اسلام ذہبی جیسی ضخیم کتبِ تاریخ میں سیکڑوں روایات علم رجال کی کتب سے لی گئی ہیں۔ ان سب کے ناقلین ایک دوسرے کے علم سے استفادہ کر کے اسلامی شخصیات کے ریکارڈ کو درجہ بدرجہ آگے بڑھاتے رہے۔ جب اسماء الرجال کے ماہرین خود تاریخ سے استفادہ کرنے کے عادی رہے ہیں تو آج تاریخ کے منکرین کس بنیاد پر تاریخ سے دست برداری کی دعوت دے رہے ہیں۔

تاریخی روایتوں کو وحی کی طرح خبرِ قطعی کا درجہ دینا بھی غلط ہے۔ علما ان میں صحیح وسقیم کا فرق ملحوظ رکھنے اور تحقیق وتنقیح کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے۔ مگر دوسری انتہا پر جا کر انہیں خرافات کا مجموعہ کہنا اور مؤرخین کو بے دھڑک سبائی ایجنٹ قرار دے دینا بھی نری جہالت ہے۔ اعتدال کی راہ یہ ہے کہ ان روایات کو اسی مقام پر رکھا جائے، جو اہلِ اصول نے مقرر کیا ہے۔ تدریب الراوی اور الکفایہ فی علم الروایہ جیسی کتب میں یہ اصول تفصیل سے موجود ہیں۔ (فلیراجع الیہ)

☆☆☆☆